PRICE Rs. 2/-

POSTED AT NDPSO ON 17-18 Sep. 2009
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/09-11,
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2009-11

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

۲۲ تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۹ء (22-28 September 2009)

شمارہ نمبر: 36 جلد نمبر: 68

کہ وہ سو گیا داستاں کہتے کہتے

یوسف ناظم کی یاد میں

منظور عثمانی (۱۷- غفور نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵)

اس دنیائے فانی میں جو بھی آیا ہے اسے جلد یا بدیر جانا بھی ہے کہ یہی قانون قدرت ہے۔ بقول فانی یہاں لافانی کوئی نہیں:

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانی
ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

کارزار ہستی میں ہر ایک کا رول متعین ہے۔ کچھ کا اتنا مختصر کہ چوکیدار کی طرح ایک سمت سے آئے اور جاگتے رہو کی صدا دے کر دوسرے دروازے سے نکل جاسوئے۔ لیکن اس کے برخلاف کچھ کا اتنا اہم کہ اول تا آخر اسٹیج پر موجود۔

اب یوسف ناظم کو ہی لے لیجیے ۹۱ سال کی عمر پائی اور بطور ظرافت نگار ۶۵ سال سے زیادہ دنیائے ادب پر چھائے رہنا کچھ کم تو نہیں لیکن جب کرتے کرتے آدمی چلا جائے تو زبان سے بے اختیار کیوں نہ نکلے کہ "ابھی مرحوم کے جانے کے دن نہیں تھے"۔ کیوں کہ موصوف اگر اور جیتے رہتے تو ادب میں کچھ اور اضافے کا سبب ہی بنتے۔ مرحوم کے قلم کا سفر جو ۱۹۴۴ء سے شروع ہوا تو تا دم مرگ ان کا اشہب قلم رواں دواں ہی رہا۔ نہ بیچ میں ماندگی کا وقفہ حائل ہوا کہ دم لے کر آگے بڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ان کے انتقال کی خبر سے ایک دن پہلے ہی تو کشمیر سے نکلنے والا 'بزم ادب' میں ان کا تبصرہ پڑھا تھا، وہی تازگی، وہی دم خم، وہی جودت، وہی روانی جو ان کا طرۂ امتیاز تھا سو اب بھی تھا۔ کہیں سے بھی تو تھکن کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اسے پڑھ کر ایک ناقد کا وہ کمنٹ باطل محسوس ہوا کہ 'اب ناظم صاحب کا قلم ہانپنے لگا ہے'۔

یوسف ناظم صاحب نے اپنے پیچھے اپنے بیش بہا ادب پاروں کا نایاب اثاثہ چھوڑا ہے جو انھیں ہمیشگی عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنا بھاری پلندہ ان غیر مطبوعہ غزلوں، تراجم، انشائیوں، پیش لفظوں اور مقدموں کا ہے جو کتابوں کی شکل میں شائع نہیں ہو سکا کیوں کہ ان کا اسپ تخلیق ایک دن کے لیے بھی لنگڑا نہیں بیٹھا۔ سدا رواں ہی رہا۔ انھیں جہاں تہاں پڑھ کر وہ مصرعہ یاد آتا تھا:

لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

کئی دہائیوں سے ہندوستان میں ظرافت نگاروں کی پہچان دو فنکاروں کے وسیلے سے ہے، جو ظرافت نگاری کی آبرو سمجھے جاتے ہیں، طویل عرصے سے یوسف ناظم صاحب اور ہم عصری مجتبیٰ حسین۔ لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جب یوسف ناظم صاحب نے لکھنا شروع کیا (۱۹۴۴ء) تو مجتبیٰ حسین طفل مکتب تھے۔ مجتبیٰ حسین نے جب پیٹ کی خاطر ہنسنا شروع کیا (۱۹۶۲ء) تو ناظم صاحب "فرد سے متفرد" ہو چکے تھے یعنی بالفاظ دیگر مجتبیٰ حسین نے ابھی پر پرزہ بھی نہ نکالے تھے کہ یہ طائر لاہوتی بن کر آسمان ادب کی اونچائیاں ناپ رہے تھے۔

مزاح کی طرف ان کے فطری رجحان کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایم اے کے لیے آپ نے اپنے مقالے کا موضوع طنز و مزاح ہی منتخب کیا تھا، اپنے گائیڈ کی اس ہدایت کے باوجود کہ یہ ٹاپک پی ایچ ڈی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ ناظم صاحب کا یہ مقالہ ۵۷۵ صفحات پر مشتمل تھا۔

ظرافت ان کی تحریروں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے، ان کے یہاں کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ زبردستی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کچھ ہے سب کچھ Spontaneous (بے ساختہ) ہے۔ کہیں منہ چڑاتے محسوس نہیں ہوتے۔ مشتاق یوسفی کے برخلاف ان کے بارے میں مشہور ہے کہ "جتنا لطف ان کی نجی گفتگو میں ہوتا ہے اس کا دس فیصد بھی ان کی تحریروں میں آ گیا ہوتا تو وہ کم از کم مشتاق یوسفی کے درجے کے مزاح نگار ضرور ہوتے"۔ میرا خیال ہے کہ ایسا کہنا کہنے والوں کی کم علمی کی دلیل ہے۔ ہمارے نقادوں (نام نہاد) کی یہ عام عادت ہے کہ ایک آدھ مضمون پڑھا (بلکہ اکثر تو سن کر ہی) اور عصائے تنقید اندھے کی لاٹھی کی طرح گھما دیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر یوسف ناظم صاحب کو غور سے پڑھا ہوتا تو یہ فتویٰ صادر نہ کرتے۔ ان کی تحریریں بھی بے پناہ لطف کی حامل ہیں پھلجھڑیاں ان کی گفتگو ہی میں نہیں تحریروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ کوئی بد ذوق ہی ہوگا جو درج ذیل جملوں پر عش عش نہ کر اٹھے:

۱- "عام طور سے مخلوط حکومت زیادہ دنوں تک برسر کار نہیں رکھی جا سکتی کیوں کہ یہ برسر کار نہیں بلکہ برسر پیکار رہتی ہے"۔ (حکومت کا تختہ)

۲- "اڈولف ہٹلر کے والد کفش دوزی کا کام کرتے تھے، اسی لیے ہٹلر نے ساری دنیا کو جوتے کی نوک پر رکھا"۔ (چند مشاہیر عالم)

۳- "زاویۂ نگاہ خواہ کسی کا بھی ہو پیچھے سے درست ہو جاتا ہے (ادب میں تو یہی طریقہ رائج ہے)

۴- "وجد صاحب فٹ بال بھی کھیلا کرتے تھے (اور فٹ بال ہی وہ تنہا کھیل ہے جس میں سر کا بھی استعمال ہوتا ہے)۔

۵- "اپنے اعزاز میں اپنے ملک سے باہر جا کر استقبالیے منعقد کروانے کا فن صرف 'چند' لوگوں کو آتا ہے۔ ان لوگوں سے شخصی طور پر ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ ہے تو بس اتنی کہ یہ اپنے وطن واپس آ جاتے ہیں"۔ (استقبالیہ)

۶- "فن شاعری سے خواتین کی دلچسپی کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔ بعض نے تو اس فن کو لوگوں کے بے حد اصرار پر اپنایا ہے۔ مشاعروں میں ان کی موجودگی کامیابی کی ضمانت ہے۔

چاہئے کلام پڑھ بھی سنائیں اور فرمائشیں پر بیٹھیں رہیں تو بھی کافی ہے"۔
(فنون لطیفہ)

۷- مظفر حسین برنی بھی آگئے ہیں خوش دکھائی دیتے ہیں (حالانکہ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ہیں)"
رپورتاژ طنز و مزاح کانفرنس، دہلی ۱۹۹۸ء

۸- "تحت سے پڑھنے والوں کا مقطع بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ تحت سے پہلا مصرعہ زبان سے نکلا نہیں کہ آوازیں آنے لگتی ہیں مقطع پڑھیے مقطع پڑھیے"۔

۹- "جگہ کی کمی کے سبب سے کچھ کتب فروش تنقیدی اور مزاحیہ کتابوں کو ایک ہی خانے میں یکجا کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ذہین قاری بھی سمجھتے ہیں کہ ہنسنا ہی مقصود ہے تو تنقیدی کتاب ہی کیوں نہ خریدی جائے۔ بعض کتب فروش حضرات کا خیال ہے کہ تنقیدی کتب کی وجہ سے مزاحیہ کتب کی بکری پر بہت برا اثر پڑا ہے"۔ (کتابوں کے بارے میں)

۱۰- "آج بچے گھروں سے اتنے لدے پھندے نکلتے ہیں گویا عالمی سیاحت پر جارہے ہیں"۔
(تعلیم بہت ہوری ہے)

۱۱- "ہمارا ملک چوں کہ چھاپہ خانوں کا ملک ہے اس لیے ماہ بہ ماہ جگہ جگہ چھاپے بھی پڑتے رہتے ہیں۔ اگر یہ سرکاری چھاپے ہوتے تو ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اور اگر کچھ ہاتھ آیا بھی تو دوسرے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہوگی"۔
(سنہ گئے جاتے تھے اس سنہ کے لیے)

۱۲- "کالج کے کسی پروفیسر کو تقریر کرنے کا موقع دیا جائے تو خواہ موضوع کچھ ہو اور بولنے کے لیے مواد کچھ نہ ہو تب بھی وہ کم سے کم ۴۵ منٹ ضرور بولیں گے کیوں کہ کالج میں جو بھی پیریڈ ہوتے ہیں وہ ۴۵ منٹ ہی کے ہوتے ہیں"...... "سیمینار میں مقالہ لاتے ضرور ہیں۔ کاغذات پوڈیم پر رکھتے بھی ہیں لیکن مقالہ پڑھتے نہیں۔ تقریر کرتے ہیں (پڑھنا تو وہ کب کا ترک کرچکے ہیں)"...... "خواتین کی تقریریں کافی دلچسپی بلکہ دل جمعی سے دیکھی جاتی ہیں"۔
(بے دہانی، بے زبانی میری)

ان کے یہاں ظرافت شرافت سے عاری نہیں ہے نہ ہی دل آزاری کا وسیلہ۔ مرحوم ہند و پاک کے پہلے ظرافت نگار ہیں جنھوں نے اتنی شدومد سے تلقین کی ہو کہ ظرافت اور شرافت دو توام بہنیں ہیں۔ انھوں نے اسے ایمان کی طرح برتا ہے۔ دونوں بہنوں نے بھی اپنے فرض کو خوب نبھایا ہے۔ کسی نے بھی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ یوسف صاحب کے مزاج میں شوخی تھی بھی ہو لیکن پھکڑپن یا ابتذال کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں۔ ان کی ظرافت کہیں بھی رکاکت یا کثافت سے آلودہ نہیں۔ طنز کیسا بھی سنگین کیوں نہ ہو لیکن اس میں "مزاح کی چاشنی، بیان کی رنگینی اور تخیل کی ندرت" کی کارفرمائی ہمیشہ نمایاں نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں حد درجہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس معاملے میں مجتبیٰ حسین ان کے سچے پیروکار ہیں۔ ان کے یہاں بھی یوسف ناظم کی طرح کہیں بھی ابتذال یا گھٹیاپن محسوس نہیں ہوتا۔ دونوں نے یہ جنگ شعوری طور سے کاندھے سے کاندھا ملاکر نہایت کامیابی اور سرفرازی کے ساتھ لڑی ہے، ورنہ بقول ماہر القادری: "مزاح و ظرافت ایک ایسا حمام ہے جس میں اچھے اچھے ننگے ہوجاتے ہیں"۔

یوسف ناظم صاحب نے اس بہتان سے کہ "ظرافت دوسرے درجے کا ادب ہے" سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ ادھر کچھ برسوں سے تدریسی نقادوں کے اس نظریے پر بیحد ملتفت ہوجایا کرتے تھے اور جل کر فرمایا کرتے "جی ہاں اس لیے کہ اول درجے کا ادب تخلیق ہی نہیں ہو رہا ہے"۔ جب کبھی موقع ملتا تو ان نقادوں پر کھل کر تیکھے وار کرنے سے نہ چوکتے (دیکھیے اقتباسات نمبر صفحات ۳، ۵، ۸، اور ۱۱)۔

ایک اور خوبی جس کا کم لوگوں نے اعتراف کیا مرحوم میں یہ تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی دل کھول کر سرپرستی اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ کسی کی درخواست کو رد کرنا وہ گناہ سمجھتے تھے چاہے اس کی تکمیل میں انھیں کتنا ہی وقت صرف کرنا کیوں نہ پڑے۔ غالب کو تو جواب پانے کے لیے "دشمن کے نام کی مہر" لگوانی پڑی تھی۔ لیکن ان کے یہاں اس التزام کی کوئی حاجت نہیں تھی بس خط لکھو اور گنبد کی صدا کے مصداق جواب پاؤ۔ یہی نہیں، اپنی کتاب پر مقدمہ داغ کرنے کی درخواست کیجیے مرحوم داغ کرنے میں مطلق توقف نہ کرتے۔ راقم الحروف ان کی تحریروں کا شروع سے دلدادہ رہا۔ گو بدقسمتی سے شرف نیاز حاصل نہ ہوسکا لیکن خط و کتابت کے توسط سے رابطہ میں رہا۔ اپنی ہر کتاب کو ان کی نذر کرنا اپنا فرض عین جانا۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کسی کتاب کی رسید نہ بھیجی ہو اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں تعریف کے ساتھ۔ خامیوں پر انگلی رکھتے بھی تو اتنی خوب صورتی سے کہ برا بھی نہ لگے۔ مثلاً میں نے "درد و درماں" پر تبصرے کی درخواست کی تو نہ صرف اس پر بھرپور تبصرہ ہی کیا بلکہ از خود "شگوفہ" کو بھیج بھی دیا۔ خامیوں پر نشان دہی کا انداز ملاحظہ فرمائیں: "میں ایک اور شکایت جو درحقیقت اردو کی مطبوعہ کتابوں کی حکایت ہے، درج کرنا چاہوں گا کہ کاش اس کتاب کی کمپوزنگ منظور عثمانی صاحب اپنے کسی دوست سے کرواتے پھر ان کے دشمنوں کے ہاتھ پڑ گئی لیکن اب جانے دیجیے اور منظور عثمانی صاحب کی محنت شاقہ کی داد دیجیے۔ یہ کتاب تو عمر عیار کی زنبیل ہے۔ اپنے مطلب کی جو چیز آپ کو چاہیے نکال لیجیے"۔

میں نے اپنی ایک اور کتاب "ہیں خواتین کچھ نظر آتی ہیں کچھ" پر پیش لفظ کے لیے درخواست کی، موصوف نے ناچیز کو ممنون احسان فرمانے میں ذرا سا بھی تامل نہ کیا۔ خورد نوازی کی مثال ملاحظہ ہو: "منظور عثمانی خامہ فرسائی کے دوران جب بھی رک کر سانس لینے کے لیے نظر اٹھاتے ہیں تو ایک نہ ایک اچھوتا عنوان انھیں اپنی طرف راغب کرتا دکھائی دیتا ہے"۔ "ان کے مضامین میں نکتوں کی بہتات اور رمز کی افراط ہے"۔ "مصنف کی کچھ تجلیاں دور کی کوڑیاں ہو ہی نہیں سکتیں۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز کے مطابق یہ کوڑیاں نہیں ہیرے کی ڈلیاں اور یہ طالوی پکھراج ہیں"... "تاہم احتیاط کا تقاضا ہے کہ کتاب کے سرورق کی جبین بے شکن و شفاف پر ایک سیاہ نشان ضرور بنادیا جائے، دفع شر کے لیے"۔

میری اگلی کتاب "محبوب کے اعضائے رئیسہ" کی وصولیابی کی اطلاع پر انھوں نے لکھا "عنوان دیکھ کر میں تو ڈر گیا تھا کہ کہیں باتصویر نہ ہو پر کھول کر دیکھا تو جان میں جان آئی"۔

ازراہ کرم مجھے بھیجی گئی اپنی کتاب "فقط" کے سرورق پر تحریر فرمایا: "عزیز مکرم 'ہیں خواتین کچھ' کے محرم اور 'کتاب کے نکاح ثانی' کے قاضی محترم جناب منظور عثمانی کو نذر 'یا' بھرتی کی ہری اردو میں" کی پیشانی پر "عزیز مکرم منظور عثمانی صاحب کے لیے اس گزارش کے ساتھ کہ منظور فرمائیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ان دنوں راقم الحروف سے خاطر خواہ ناراض ہیں۔ ان کی خفگی میں اضافہ کے لیے ایک غیرضروری تحفہ" (یوسف ناظم)۔

نوٹ: میری کیا مجال تھی اس عظیم ہستی سے ناراض یا خفا ہونے کی۔ واقعہ یہ تھا کہ ناچیز نے ایک مضمون "یوسف ناظم - ایک عظیم طناز" کے عنوان سے لکھا تھا جو "ظرافت" میں شائع ہوا تھا۔ موصوف نے اسے ہی پڑھ کر مجھے لکھا تھا "مجھے علم نہیں تھا کہ آپ کے دل میں میری طرف سے اتنی کدورت بھری ہوئی ہے" (اسی کی طرف اشارہ ہے)۔

آج جب ممدوح اس دنیا میں نہیں تو ہم جیسے بے بضاعتوں کی سرپرستی کون کرے گا۔ اس طرح کی عظمت کا ثبوت صرف وہی دے سکتا ہے جو صحیح معنوں میں خود عظیم ہو۔ ورنہ دوسروں کے کندھوں پر چڑھ کر طویل القامتی کے دعویداروں سے اس کی توقع ہی فضول ہے۔ جو بچارے خود ہی محتاج ہوں وہ بھلا دوسروں کو کیا دے سکتے ہیں۔

دنیا کا دستور ہے (اپنے یہاں تو خصوصاً) ادیب مرنے کے بعد ہی معتبر قرار پاتا ہے۔ مرنے والا اپنی زندگی میں کیسا ہی باہنر کیوں نہ ہو، ناقدری اہل کا شاکی ہی رہتا ہے۔ ایسا ہی کچھ یوسف ناظم صاحب کے ساتھ بھی ہوا۔ بھلا دیرینہ روایت سے انحراف کرکے کیوں گنہگار ہوتے۔ طفیل جعفری نے صحیح لکھا ہے کہ:

"ہم ناظم صاحب کے ساتھ سو فیصد تو کیا پاؤ فیصد بھی انصاف نہیں کرسکے ہمارے اوپر یوسف ناظم صاحب کا ادبی قرض ہنوز باقی ہے"۔

زبیدہ ظفر صاحب نے کہا:

"بلاشک وہ طنز و مزاح کے قافلے کے میر کارواں تھے"۔

سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ مرنے کے بعد ہی کیوں یاد آتا ہے۔ وہ اگر میر کارواں تھے تو بقول پروین یداللہ مہدی "ناظم صاحب کا شمار بلاشبہ صف اول کے ظرافت نگاروں میں ہوتا ہے بلکہ صف اول میں بھی ہم عصر مزاح نگاروں کے مقام سے بھی آگے مقام ہے ان کا" تو ان کی زندگی میں اس کا کھل کر اعتراف کیوں نہیں کیا گیا۔

جن احباب نے یوسف ناظم صاحب کو تفصیل سے پڑھا ہے وہ ان آرا سے صد فیصد اتفاق کریں گے کہ یہ کچھ دیر سے بولا گیا ہے ورنہ وہ ساہتیہ اکیڈمی، پدم شری اور مخدوم محی الدین جیسے بڑے ایوارڈوں سے محروم نہ رہتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نفسا نفسی کے اس دور میں ان کی عظمت کو Back burner پر رکھ دیا گیا ہو کیوں کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سچے حقدار کو صف میں دیکھ کر نسبتاً کمتر لوگوں کو ہول دلی ہونے لگتی ہے۔ ادھر یوسف ناظم جیسا مست قلندر سیدھا سادا اس گمان میں رہے کہ "جو لوگ کاسہ دریوزہ گری لے کر نہیں گھومتے 'گولڈ کپ' کے وہی مستحق قرار پاتے ہیں"۔

مجتبیٰ حسین (جو بقول یوسف ناظم عمر میں مجھ سے چھوٹے مگر عمل میں مجھ سے بڑے بلکہ بڑھ کر ہیں) نے بالکل درست کہا ہے کہ "آج کے حالات میں اگر مجنوں بھی زندہ ہوتا تو اپنی صحرانوردی اور چاک دامانی کے عوض صلے یا معاوضے کی دوڑ میں شامل ہوتا"۔

بہرحال موصوف اپنی کج کلاہی تھامے سرکیے پیوند خاک ہوگئے کیا اب بھی حیدرآبادی اور مہاراشٹرین، جن پر وہ ہمیشہ فخر کرتے رہے اور جن کی بڑی پاور فل لابی ہے مرحوم کا جائز اور واجب حق دلانے کی کوشش نہ کریں گے (مرنے کے بعد ہماری فیاضی اور احسان شناسی تو یوں بھی ضرب المثل ہے)۔ ان کا حق وہ اکیڈمیاں یعنی آندھرا پردیش اور مہاراشٹرا اکیڈمیوں پر عائد ہوتا ہے۔ وہ کم از کم اتنا تو کرہی سکتی ہیں کہ:

۱- ان کی بہترین تحریروں کو یکجا کرادیں۔
۲- ان کے نام پر سالانہ ایوارڈ شروع کریں۔
۳- اور اپنے سب سے بڑے ایوارڈز انھیں دے کر (پس مرگ ہی سہی) خود کو سرفراز کریں۔

مرحوم کو خدا اعلا ترین مدارج پر فائز فرمائے۔ آمین!

○○○

بیسویں صدی کا ایک اصلاحی رسالہ 'سودمند'

تسلیم غوری بدایونی (۲۴۴- سرائے جالندھری، بدایوں [۲۴۳۶۰۱] یو پی)

اردو صحافت کی ابتدا تو انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ہو گئی تھی مگر اس صنف کو عروج بیسویں صدی عیسوی میں نصیب ہوا۔ مشہور زمانہ اردو رسائل مخزن، زمانہ، نگار اور اردوئے معلی اسی صدی عیسوی میں وجود میں آئے اور خوب شہرت پائی اور دیکھتے ہی دیکھتے تاریخ اردو صحافت میں اپنا مقام بنا کر چلے گئے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں متعدد اصلاحی تحریکیں بھی وجود میں آئیں اور اصلاحی رسائل پر منظر عام پر آئے جنھوں نے معاشرے کو سدھارنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ایسے ہی اصلاحی رسالوں میں ایک رسالہ 'سودمند' بھی تھا جو بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں علی گڑھ سے نکلنا شروع ہوا۔

پچھلے دنوں ایک ردی والے سے 'سودمند' کے چند شمارے دستیاب ہوئے جن کو میں نے ردی والے سے خرید کر سنوار کر اپنے ذخیرۂ کتب میں شامل کر لیا۔ قارئین 'ہماری زبان' کو اس اصلاحی رسالے سے روشناس کرانا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اہل ادب و صحافت اس رسالے کے خدوخال سے واقف ہو سکیں۔ اس سے پہلے کہ رسالہ 'سودمند' کا ذکر کیا جائے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے بانی مولوی طفیل احمد منگلوری متوفی ۱۹۳۶ء کے بارے میں قارئین کو روشناس کرا دوں۔

مولوی سید طفیل احمد منگلوری کا وطن صوبہ اتر پردیش کا مشہور و معروف علاقہ سہارنپور کا قصبہ منگلور تھا جو اب صوبہ اتراکھنڈ میں شامل ہے۔ اسی منگلور کے ایک سادات گھرانے میں ۴ر ستمبر ۱۸۶۸ء کو سید نذیر حسین کے گھر سید طفیل احمد منگلوری پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محلے کے مکتب میں حاصل کی۔ ۱۸۷۹ء میں علی گڑھ کے اسکول میں داخل کرائے گئے۔ ۱۸۸۷ء میں انٹرنس اور ۱۸۸۹ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

ملازمت کا آغاز مشہور و معروف علاقہ رڑکی سے کیا لیکن جلد ہی سب رجسٹرار کے عہدے پر آپ کا تقرر ہو گیا اور آپ رڑکی سے علی گڑھ چلے گئے۔ علی گڑھ کے علاوہ شاہ جہاں پور، ایٹہ، مظفر نگر، مرزا پور اور بریلی جیسے اضلاع میں اپنی سرکاری خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے ہی وظیفہ یاب ہوئے اور علی گڑھ کو ہی اپنے علمی و عملی میدان کا مرکز بنایا اور ادبی کاموں میں لگ گئے۔

۱۹۳۶ء میں بیماری نے آن گھیرا اور اتنا طول کھینچا کہ علاج کی غرض سے علی گڑھ سے رڑکی چلے گئے جہاں ۳۰ر مارچ ۱۹۳۶ء کو اس ادبی مرد مجاہد نے آخری سانس لی اور منگلور کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اخلاف میں ایک بیٹے محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ الٰہ آباد ہائی کورٹ اور ہزاروں کی تعداد میں چاہنے والے چھوڑے۔ ان کے ایسے ہی چاہنے والوں میں ایک نام مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی متوفی ۱۹۴۷ء کا بھی تھا جو ہفت روزہ 'ذوالقرنین' کے بانی و ایڈیٹر اور مطبع نظامی بدایوں کے مالک تھے۔ نظامی بدایونی نے اپنے مرحوم دوست کی یاد میں اپنے اخبار کا خاص نمبر ۱۹۳۶ء میں شائع کیا تھا جو طفیل نمبر کے نام سے ادبی و صحافتی تاریخ میں امر ہو گیا ہے۔ نظامی بدایونی اور طفیل احمد کی ملاقات اپریل ۱۸۹۹ء میں شاہ جہاں پور میں ہوئی تھی جہاں نظامی بدایونی کلکٹری شاہ جہاں پور میں ملازم تھے اور طفیل احمد منگلوری ایٹہ کی تحصیل کاس گنج سے تبادلہ ہوکر وہاں پہنچے تھے۔ ان دونوں کی ملاقات نے اٹوٹ بندھن کی شکل اختیار کی اور ان دونوں بزرگوں نے دوسرے شاہ جہاں پوری اکابرین کو ساتھ لے کر ایک تنظیم 'اخوان الصفا' قائم کی اور قوم کی بدحالی کو درست کرنے کے لیے اصلاحی مضامین لکھنا شروع کیے۔ طفیل احمد منگلوری نے 'انسانی اوہام' عنوان سے مضامین لکھے جو اٹاوہ کے مشہور اخبار 'البشیر' میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کو مولانا نظامی بدایونی نے یکجا کر کے ۱۹۰۱ء میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے اسی نام سے شائع کروا دیا۔ طفیل احمد منگلوری کی یہ پہلی کتاب وجود میں آئی جو اب نایاب ہے۔ اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور یکے بعد دیگرے تقریباً ایک درجن کتب تحریر کیں اور شائع کرائیں جن میں 'مسلمانوں کا روشن مستقبل' ان کی یادگار زمانہ تصنیف ہے جو ۱۹۳۸ء میں پہلی مرتبہ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ مولانا منگلوری کی حیات میں ہی اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ غیر منقسم ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کتاب کو پڑھنا بہت ضروری ہے۔ اس عظیم کتاب کی تلخیص مولانا منگلوری نے اپنی زندگی میں ہی 'روشن مستقبل' نام سے ۱۹۳۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع کرا دی تھی۔ اب یہ کتاب بھی دیکھنے کو نہیں ملتی، مگر میرے کتب خانے میں دونوں کتابیں محفوظ ہیں۔

مولوی طفیل احمد منگلوری اور نظامی بدایونی دونوں ہندوستان میں مسلمانوں کی گرتی ہوئی ساکھ اور ان کی تعلیم سے بے رغبتی کی وجہ سے بڑے کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ انھوں نے مسلم قوم کی حالت زار کو سدھارنے کے لیے قلم اور عمل دونوں سے بھرپور کوشش کی۔ یہ دونوں بزرگ سر سید احمد خاں مرحوم کی تعلیمی پالیسی سے متفق تھے اور ان کے پروگرام کو آگے بڑھانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ مولانا منگلوری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری اور وائس پریسیڈنٹ بھی رہے۔ انھوں نے اس کانفرنس کی معرفت مسلمانوں میں پھیلی ہوئی خامیوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ انتہا ہی نہیں جب ۱۹۲۷ء میں وہ صوبائی کونسل کے ممبر بنے تو ایوان میں بھی انھوں نے مسلمانوں کے متعلق سے ہر مسئلے کو بلا خوف و خطر اٹھایا۔ ان کا ہر قدم ملک و قوم کی فلاح و بہبود میں ہی اٹھتا تھا۔

مولانا منگلوری نے مسلمانوں کی معاشی اور اقتصادی حالت کو سدھارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا وہ چونکہ ایک ایسے عہدے پر فائز تھے جہاں روزانہ ان کا سابقہ ایسے معاملات سے پڑتا تھا جہاں مسلمانوں کی املاک دوسروں کے نام بیع کی جاتی تھیں یا کفالتی قرضوں میں مکفول ہوتی تھیں۔ قرضہ لینے والا اس بات سے لاعلم ہوتا تھا کہ قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت نکل سکے گی بھی یا نہیں۔ سود در سود سالانہ اور ششماہی کا بھی وہ فرق نہ جانتے تھے، اس بات سے ان کو احساس ہوا کہ مسلمانوں کی بدحالی کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے۔ اس لیے انھوں نے اس مسئلے پر غور و خوض کیا اور اپنے احباب میں اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا کہ مسلم قوم کو قرض اور سود کے اس پھندے سے کیسے نکالا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اور ان کے رفیق دیرینہ مولانا نظامی بدایونی نے اخبار و رسائل میں مضامین لکھے اور ۱۹۲۰ء میں ایک کتابچہ 'سود اور مسلمانوں کا مستقبل' لکھ کر شائع کرایا جس میں مسلمانوں کو تجارتی، اقتصادی اور کاروباری کامیابیوں کے راز بتائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور رسالہ (کتابچہ) 'سرمایہ داروں کی غلامی اور مسلمان' شائع کرایا۔ جب اس سلسلے میں بہت سے مضامین اور کتابچے شائع ہو گئے تو انھوں نے مسلم قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لیے ایک ماہنامہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ یکم جون ۱۹۲۵ء کو ماہانہ 'سودمند' کا پہلا شمارہ علی گڑھ سے منظر عام پر آیا جو خان بہادر سید جعفر حسین کی ادارت میں شائع ہوا کیوں کہ اس وقت مولانا منگلوری سرکاری ملازمت میں تھے اور وہ رسالے کے ایڈیٹر نہیں ہو سکتے تھے البتہ رسالے کا پورا مواد مولانا طفیل احمد منگلوری کا ہی ایڈٹ کیا ہوا تھا۔ رسالہ 'سودمند' جاری کرنے کے اغراض و مقاصد درج ذیل تھے:

۱- افراد قوم کو ترغیب دینا کہ وہ سادہ اور غریبانہ زندگی بسر کرکے مسلمانوں کو افلاس و گداگری کی مصیبت سے نجات دلائیں۔

۲- مسلمانوں کو آمادہ کرنا کہ وہ زیادہ سے زیادہ روپیہ انجمن ہائے امداد باہمی قومی اور ملکی بینکوں اور ہر قسم کے کاروبار میں لگائیں جس سے عام شرح سود گھٹ کر ربا کو جو بربادکن اور حرام ہے، مٹا دے۔

۳- فضول اور بربادکن رسم و رواج کی اصلاح کرنا اور کفایت شعاری کے طریقے بتانا۔

۴- مختلف مقامات کے مسلمانوں کی اقتصادی اور کاروباری حالت کے متعلق معلومات پیش کرنا اور مختلف کاروبار اور تجارتوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا۔

۵- مسلمانوں کی صحت جسمانی و ذہنی ترقی اور عام بہبود کے متعلق مضامین شائع کرنا۔

ماہنامہ 'سودمند' کے قواعد و ضوابط میں تحریر تھا کہ اس رسالے کا سالانہ چندہ دو روپیہ اور ممالک غیر سے دو روپیہ آٹھ آنہ لیا جائے گا جب کہ اس رسالے کی ماہانہ قیمت فی پرچہ تین آنہ طے کی گئی تھی۔ یہ ماہنامہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ رسالے کی درخواست خریداری مع قیمت منی آرڈر کے ذریعے ہی منظور ہوتی تھی، نمونے کا پرچہ ایک آنہ کا ڈاک ٹکٹ روانہ کرنے پر ہی بھیجا جاتا تھا۔ 'سودمند' کے سرورق پر سب سے اوپر یہ شعر درج ہوتا تھا:

سود بہبود اور فلاح قوم ہے مجھ کو پسند
قوم کا خادم ہوں میں ہے نام میرا سودمند

۱۹۲۶ء میں جب مولانا منگلوری سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہو گئے تو انھوں نے رسالے کے ایڈیٹر کی ذمہ داری

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

اردو میں بھی ریلوے کا امتحان دے سکیں گے طلبہ

منیتا بنرجی

کولکاتا (۱۷ ستمبر)۔ ریلوے کی وزیر ممتا بنرجی نے کل شام پارک سرکس میں منعقد ایک افطار پارٹی میں اعلان کیا کہ ریلوے بھرتی بورڈ کے امتحان میں اب اردو والے بھی اپنی مادری زبان میں جواب دے سکیں گے۔ اس سے قبل تک صرف ہندی اور انگریزی زبان میں ہی یہ امتحان ہوا کرتے تھے۔ ممتا بنرجی نے کہا کہ اب بھی امیدوار اپنی مادری زبان میں امتحان دے سکیں گے۔ ممتا بنرجی کے اس اعلان سے نہ صرف اردو والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے بلکہ مہاراشٹر اور کرناٹک کے لوگ بھی بے انتہا مسرور ہیں کیوں کہ وہاں کافی دنوں سے اس بات کا مطالبہ کیا جارہا تھا کہ ریلوے کی بھرتی میں مقامی زبان جاننے والے لوگوں کو بھی مواقع ملنا چاہیے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

مرکزی حکومت نے اردو درخواست کو لوٹا دیا

مہربانی کر کے اس کا ہندی ترجمہ بھی بھیجیے، درخواست دینے والے کو جواب

الہ آباد (۱۳ ستمبر)۔ مرکزی حکومت کے محکمہ انتظامی اصلاح و عوامی شکایت کے انڈر سکریٹری نے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر پرواز علوم کو ایک خط مورخہ ۱۹ اگست ۲۰۰۹ کو لکھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آپ کے ذریعے بھیجی گئی منسلک شکایتی دستاویز اس گزارش کے ساتھ واپس کی جارہی ہے کہ برائے مہربانی اس کا ہندی ترجمہ ساتھ میں بھیجیں تاکہ اس پر اگلی کارروائی کی جاسکے۔ مذکورہ خط کی فوٹو کاپی اردو میڈیا کو مہیا کراتے ہوئے تنظیم نے کہا کہ مرکزی حکومت نے یہ خط لکھ کر آئین ہند کی دفعہ 250 کو نظر انداز کرنے کے ساتھ ہی اپنے ہی بنائے گئے قوانین و ضوابط کی قانون شکنی کی ہے۔ محکمہ انتظامی اصلاح و عوامی شکایات سے چندہ سال قبل مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۹۴ کو ایک نوٹیفکیشن جاری کیا گیا تھا جس میں تمام محکموں کو ہدایت دی گئی تھی کہ مختلف ریاستوں سے علاقائی زبان میں آنے والی درخواستوں کا ہندی یا انگریزی ترجمہ کرانے کے لیے محکمہ میں موجود علاقائی زبان جاننے والے ملازمین و افسران کا سہارا لیا جائے اور ترجمہ کرنے کی اجرت ۲۰ روپے صفحہ دی جائے۔

تنظیم نے سوال کیا کہ مرکزی حکومت کے عوامی شکایتی محکمہ میں ایک بھی اردو تعلیم یافتہ ملازم و افسر نہیں ہے جس سے تنظیم کی اردو میں لکھی درخواست کا ہندی ترجمہ کرایا جاسکے اگر نہیں ہے تو مرکزی حکومت کو اس کا انتظام کرنا چاہیے اور ہر ایک دفتر میں اردو ٹرانسلیٹر کی تقرری کرنی چاہیے۔

تنظیم کے قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے کہا کہ وہ اپنی درخواست کا ہندی ترجمہ نہیں بھیجیں گے کیوں کہ آئین ہند کے دستور 250 کے تحت یہ حق دیا گیا ہے کہ اردو داں عوام اپنی شکایتی درخواست ریاست میں بولی جانے والی زبان میں لکھ کر دے سکتے ہیں۔ اگر ڈپارٹمنٹ آف ایڈمنسٹریٹو ریفارمیشن اینڈ پبلک گریوانسیز نے تنظیم کی درخواست کا تصفیہ نہ کیا تو عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

مہاراشٹر میں اردو یونیورسٹی

ممبئی۔ مہاراشٹر کے وزیر اعلا اشوک چوہان نے مسلم تنظیموں کے سربراہوں اور رہنماؤں کی ایک میٹنگ میں جو ریاستی وزیر اقلیت محمد عارف نسیم خان کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی تھی، کہا کہ ریاستی اقلیتی محکمہ کارکردگی کی رپورٹ اسمبلی میں پیش کی جائے گی اور اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔

(دعوت۔ نئی دہلی)

نوودیہ اسکول میں اردو اساتذہ کی تقرری کا مطالبہ

کشن گنج (۱۷ ستمبر)۔ سب سے پس ماندہ ضلع کشن گنج میں کافی کوششوں کے بعد یہاں کے لوگوں میں تعلیمی بیداری آئی ہے۔ سرکاری و غیر سرکاری اسکولوں میں طلبہ و طالبات کی بڑھتی ہوئی تعداد سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کشن گنج جو ملک کا سب سے پس ماندہ اور پچھڑا ضلع ہے، تعلیم کے تئیں یہاں کے لوگوں میں بیداری آئی ہے تو دوسری طرف ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو کو اس کا جائز حق دلوانے کے لیے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کا قیام عمل میں آیا، جس کے صدر محمد یونس نے روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آرگنائزیشن کا مقصد اردو کو اس کا جائز حق دلوانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نوودیہ اسکول میں اردو ٹیچر کا نہ ہونا افسوس ناک ہے۔ جبکہ اسکول میں اردو طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد ہے۔ اردو آرگنائزیشن کے کارکنوں کے علاوہ سیکڑوں لوگوں نے نوودیہ اسکول میں اردو ٹیچرس کا مطالبہ کرتے ہوئے ممبر پارلیمنٹ سے مداخلت کرنے کی اپیل کی ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

وزیر اعلا تعلیم سے اردو مسائل پر نمائندگی

حیدرآباد (۳ جون)۔ ریاست کے مختلف اضلاع سے آئے ہوئے مندوبین کے ایک وفد نے محمد جلیل پاشا (صدر کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی) کی قیادت میں جناب ڈی سری دھر بابو وزیر اعلا تعلیم حکومت آندھرا پردیش سے ملاقات کر کے اردو کے حل طلب مسائل پر بات چیت کی اور ان سے خواہش کی کہ ریاست کے جونیر و ڈگری کالجوں میں اردو کی خالی اسامیوں کو پُر کریں اور اردو میڈیم کالجوں میں اردو داں افراد کو فائز کریں۔

اردو کے نفاذ پر وزیر اعلا توجہ دیں

اردو ملازمین کے مسائل کے حل تک کوشش جاری رہے گی۔ اقبال حیات

سیتا مڑھی (۲۶ اگست)۔ صوبے میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملے ۲۸ سال ہوگئے، لیکن صوبائی حکومت کے محکموں اور دفتروں میں اردو خستہ حال ہے۔ حالت یہ ہے کہ کمشنری سے لے کر بلاک آفس تک بحال اردو مترجم، معاون مترجم و ٹائپ رائٹر وغیرہ سے اردو کا کام نہیں لیا جارہا ہے۔ ان ملازموں سے افسران آفس کا دوسرا کام لیتے ہیں یہاں تک کہ آفس کے نام پر افسروں کے نام پلیٹ بھی اردو میں نہیں لگیں گے۔ اس بابت بہار ورکنگ جرنلسٹ یونین نے وزیر اعلا نتیش کمار کو اخبار کے توسط سے درخواست کی ہے کہ صوبے میں اردو کی بدحالی کو دور کیا جائے۔ یونین کے کنوینر صلاح الدین خاں نے بتایا کہ صوبائی حکومت کا کوئی بھی ایسا محکمہ نہیں ہے جسے اردو کو قانونی حق دینے کے معاملے میں بطور نمونہ پیش کیا جائے۔ وزیر اعلا کو متوجہ کرتے ہوئے جناب خان نے کہا کہ سرکار اگر وقت رہتے اردو کی ترقی پر دھیان نہیں دیتی ہے تو مشترکہ تہذیب کی یہ زبان صوبے کی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی، جس سے ایک بڑی آبادی متاثر ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے کام کا حلقہ اردو ملازمین کی تنخواہ ان کے تبادلے اور ان کے حقوق دیگر معاملوں کے نپٹارے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسری جانب راج بھاشا اردو ملازمین ایک طرف کم تنخواہ اور ترقی عہدہ سے محرومی کا شکار بنا دیے گئے ہیں وہیں دوسری جانب انھیں تنخواہ بھی گزشتہ چار ماہ سے نہیں ملی، جس کے سبب یہ قلیل تنخواہ پانے والے اردو ملازمین شدید معاشی پریشانیوں سے دوچار ہیں، مگر ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ یہ باتیں راج بھاشا کرمچاری سنگھ بہار کے ریاستی صدر اقبال حیات نے اپنے ایک اخباری بیان میں کہیں۔ انھوں نے اطلاع دی ہے کہ کافی تاخیر سے حکومت بہار نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۰ اگست ۲۰۰۹ء کے ذریعے ریاست کے تمام ۳۸ ضلعوں اور صدر دفتر کے اردو ملازمین کی تنخواہ کے لیے مبلغ 17 کروڑ 45 لاکھ 29 ہزار روپے جاری کر دیے ہیں۔ جناب اقبال نے اردو ڈائرکٹوریٹ کی بے اختیاری پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا اور اسے افسر شاہوں کی سازش قرار دیا ساتھ ہی نتیش حکومت پر الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود اس معاملے میں دل چسپی نہیں لے رہی ہے ورنہ یہ معاملہ کب کا حل ہو گیا ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ سنگھ اردو ملازمین کے تمام مسائل کے حل ہونے تک اپنی جدوجہد جاری رکھے گا۔

(ہمارا سماج۔ دہلی)

اردو اکادمی کے وظائف سے فائدہ اٹھانے کی اپیل

لکھنؤ (۳۰ اگست)۔ اترپردیش اردو اکادمی کو تعلیمی سال ۱۰-۲۰۰۹ء سے متعلق وظائف دینے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔ اردو مضمون کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے والے درجہ چہار تا ایم اے تک ایسے طلبہ و طالبات سے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں جو اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے لے رکھا ہو اور اترپردیش کے رجسٹرڈ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہے ہوں۔ مندرجہ بالا درجات کے صرف انھی طلبہ و طالبات کی درخواست فارموں پر غور کیا جائے گا جنھوں نے اپنا گزشتہ سالانہ امتحان اردو مضمون میں کم از کم پچاس فیصد اور مجموعی طور پر کم از کم ۴۵ فیصد نمبروں سے پاس کیا ہو۔ اس کے علاوہ ایم اے کے طلبہ و طالبات نے اپنا گزشتہ امتحان اردو میں کم از کم ساٹھ فیصد اور مجموعی نمبر ۴۵ فیصد سے پاس کیا ہو۔ اردو مضمون کے ریسرچ اسکالر سے جن کا پہلا سال ہو، اکادمی کے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں، اس کے علاوہ سال دوم و سوم کے صرف وہ ریسرچ اسکالر اپنی درخواست بھیج سکتے ہیں جنھیں اکادمی سے سال اول و دوم میں وظیفہ مل چکا ہے۔ ایسے طلبہ و طالبات کو

نیز آندھرا پردیش ورشٹی پی جی کالج میں ۲۰۰۷ء ایم کام اردو میڈیم کو حکومت کی جانب سے منظوری مل چکی ہے لیکن آج تک کلاسوں کا آغاز نہیں ہوسکا۔ اندرا پریہ درشنی پی جی ایم اے اکنامکس اردو میڈیم ایک واحد کالج ہے جہاں پر اب تک ۹ بیچس مکمل ہو چکے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقررات کا مطالبہ

حیدرآباد (۲۷ اگست)۔ رکن اسمبلی جناب احمد پاشاہ قادری نے آج ایوان اسمبلی میں وقفۂ صفر کے دوران اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ حکومت نے مجلس کی تائید پر اردو میڈیم اساتذہ کی خالی ایس سی، ایس ٹی اور بی سی اسامیوں کو اوسی زمرے میں تبدیل کرنے کے لیے ۲۰۰۸ء میں جی او نمبر 74 جاری کیا تھا، ۲۰۰۸ء میں ڈی ایس سی کے تحت اردو اساتذہ کے تقررات کیے گئے لیکن عادل آباد اور میدک میں اوسی زمرے کے تحت کوئی تقررات نہیں کیے گئے۔ اس کے علاوہ جسمانی معذورین کے زمرہ میں خالی اسامیوں پر اردو ٹیچرس کے تقررات عمل میں نہیں لائے گئے۔ احمد پاشاہ قادری نے ریاستی وزیر اسکولی تعلیم سے مطالبہ کیا کہ وہ اس ضمن میں فوری اقدامات کرتے ہوئے تقررات عمل میں لائیں۔ ریاستی وزیر ابتدائی تعلیم محمد احمد اللہ نے کہا کہ وہ اس مسئلے کو نوٹ کر چکے ہیں اور بہت جلد اقدامات کیے جائیں گے۔ (منصف۔ حیدرآباد)

خواتین یونیورسٹی بیجاپور میں شعبۂ اردو قائم کرنے کا مطالبہ

بنگلور (۱۵ جولائی)۔ خواتین یونیورسٹی بیجاپور میں پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو کا قیام اور ریاست بھر میں نئے شروع کیے گئے اور موجود پری یونیورسٹی (جونیر) ڈگری کالجوں میں اردو کی اسامیوں کو پُر کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا گیا ہے۔ خواتین یونیورسٹی بیجاپور کے سنڈیکیٹ کے ارکان جناب ریاض جعفرانی اور جناب ارون شاہ پور نے آج یہاں ریاستی وزیر برائے اعلا تعلیم جناب اروند لمباولی سے ملاقات کر کے اس خصوص میں ایک میمورنڈم پیش کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ خواتین یونیورسٹی بیجاپور شمالی کرناٹک میں اردو کی کثیر آبادی والے علاقوں پر مشتمل ہے جہاں اردو میڈیم کے سیکڑوں پرائمری اور ہائی اسکول قائم ہیں اور جونیر اور ڈگری کالج سے ہر سال سیکڑوں میں طالبات فارغ ہورہی ہیں مگر اعلا تعلیم کے مواقع بالخصوص اردو میں پوسٹ گریجویٹ کورس نہ ہونے کے سبب اردو سے اپنا رشتہ ترک کررہی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ خواتین یونیورسٹی بیجاپور کے لیے ایک مناسب و موزوں ادارہ ہے جہاں پر پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو کا قیام ضروری ہے۔ میمورنڈم میں ریاست کے بیشتر سرکاری جونیر اور ڈگری کالجوں میں اردو لکچرر نہیں ہونے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ریاست میں پہلے سے قائم غیر سرکاری اور سرکاری جونیر اور ڈگری کالجوں میں اردو لکچررس کے ریٹائر ہونے کے بعد اکثر کالجوں سے اردو سبجکٹ نکال دیا گیا ہے یا اردو لکچررس کی بھرتی نہیں ہوئی ہے۔ وزیر برائے اعلا تعلیم کے ساتھ نصف گھنٹہ تک ہوئی ملاقات میں جناب اروند لمباولی نے اردو زبان کے متعلق اپنے بہترین تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اس بات پر تعجب کیا کہ ابھی تک خواتین یونیورسٹی بیجاپور میں پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو قائم نہیں کیا گیا ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ وہ اس خصوص میں فوری اقدامات کرتے ہوئے متعلقہ محکمہ کو احکامات جاری کریں گے۔ شری اروند لمباولی نے جونیر اور ڈگری کالجوں میں اردو کی خالی اسامیوں اور نئے شروع کیے گئے کالجوں میں اردو سبجکٹ رکھنے کے متعلق بھی سنجیدگی کا اظہار کیا۔

(سالار۔ بنگلور)

بھی مقررہ تعداد میں وظائف دیے جائیں گے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اور وہ انٹر تا ایم اے میں اردو ایک لازمی/ اختیاری مضمون کی حیثیت سے لے کر اترپردیش کے کسی تسلیم شدہ تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کررہے ہوں۔ ان طلبہ و طالبات کے لیے وظائف کے قواعد و ضوابط بھی وہی ہوں گے جو عام امیدواروں کے لیے ہیں۔ صرف پچھلے درجے میں مجموعی نمبروں کی بنیاد پر وظیفہ منظور کیا جائے گا۔ جسمانی طور پر جو طلبہ و طالبات معذور ہیں اور اردو پڑھ رہے ہیں انھیں بھی محدود تعداد میں وظیفہ دیا جائے گا۔ درخواست فارم سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ سے ٹکٹ لگا لفافہ جس پر نام اور پتہ صاف صاف درج ہو بھیج کر یا دستی طور پر مفت حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

(ہندوستان ایکسپریس۔ دہلی)

بی جے آر گورنمنٹ ڈگری کالج میں اردو لکچررس کے تقرر کا مطالبہ

حیدرآباد۔ بی جے آر گورنمنٹ ڈگری کالج نامپلی میں اردو زبان کی تدریس کا انتظام نہ ہونے سے طلبہ کو دشواریوں کا سامنا ہے۔ نامپلی چوں کہ ایک کثیر اقلیتی آبادی والا علاقہ ہے اور اس کالج میں مسلم طلبہ کی کثیر تعداد زیر تعلیم ہے لیکن یہاں اردو لکچرار کے نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ دیگر زبان بحیثیت دوسری زبان پڑھنے پر مجبور ہیں۔ اردو تحریک حیدرآباد کے ایک وفد نے آج وزیر اقلیتی بہبود اور اردو اکیڈمی احمد اللہ سے ان کے چیمبر واقع سکریٹریٹ میں ملاقات کر کے ایک یادداشت پیش کی اور مطالبہ کیا کہ بی جے آر گورنمنٹ ڈگری کالج میں اردو لکچرار کی اسامی منظور کروائیں تاکہ اردو پڑھنے والے طلبہ کو نہ صرف آسانی ہو بلکہ انھیں مستقبل میں فائدہ بھی حاصل ہوسکے۔ وزیر اقلیتی بہبود سید احمد اللہ نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ خصوصی دل چسپی لے کر جلد از جلد بی جے آر کالج میں اردو لکچرار کی اسامی منظور کروائیں گے۔

(منصف۔ حیدرآباد)

اردو کتب واخبارات خریدنے کے لیے کتب خانوں کو مالی امداد

۳۰ ستمبر تک درخواستیں مطلوب

لکھنؤ۔ سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی کی اطلاع کے مطابق رواں مالی سال کے لیے اترپردیش کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں/ دارالمطالعوں نیز ان ڈگری/ پوسٹ گریجویٹ کالجوں، جنھوں نے رواں تعلیمی سال ۱۰-۲۰۰۹ء میں پہلی بار ڈگری سطح پر اردو سیکشن کھولے ہوں، اردو کتابیں اور اخبارات و رسائل کی خریداری کی غرض سے اکادمی کے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ فارم اور قواعد و ضوابط اترپردیش اردو اکادمی وبھوتی کھنڈ گومتی نگر لکھنؤ سے بلا قیمت حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ سکریٹری کی اطلاع کے مطابق اترپردیش کی اقامتی یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو میں قائم لائبریریوں کے لیے بھی گرانٹ منظور کیا جانا شامل ہے۔ یہ گرانٹ صرف ایک بار ہی دی جائے گی بشرطیکہ دفتر کو درخواست اکادمی کے مقررہ فارم پر موصول ہو۔ اترپردیش اردو اکادمی کے دفتر میں درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۹ء ہے۔ یہ تاریخ قطعی اور حتمی ہے۔ گزشتہ برسوں میں جن لائبریریوں نے درخواستیں ارسال کی تھیں انھیں بھی از سر نو درخواست بھیجنا لازمی ہے۔

(آگ۔ لکھنؤ)

عادل آباد کے اردو میڈیم اساتذہ کے ساتھ ناانصافی

دعول (۱۰ ستمبر)۔ ضلع عادل آباد میں جنوری و فروری میں ریاستی سطح پر ہر ضلع کی طرح اس ضلع میں بھی اساتذہ کی قابلیت کی بنا پر ترقیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دیگر میڈیم کے ساتھ اردو میڈیم کے اساتذہ کی ترقی کی راہ ہموار کی گئی۔ حکومت کے تعلیمی رولس کے مطابق 70 فیصد اسامیوں کو ترقی دے کر پُر کرنا تھا۔ لیکن ڈی ای او عادل آباد نے اس کے برخلاف چند اسامیوں پر ترقی دے دی جب کہ امیدوار مختلف مضامین کے دستیاب ہیں اور باقی اسامیوں کو ڈی ایس سی کے تحت روک لگا دی جب کہ برسوں سے یہ دیکھا گیا کہ اردو والوں میں ایس سی ایس ٹی نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ڈی ای او کا اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک نہیں تو اور کیا ہے جب کہ کئی بار ڈی ای او اور کلکٹر سے شکایت کی گئی ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا

التماسِ مخلصانہ

میرے مخلص و محترم دوستو
نہ سوچو کہ اردو زباں مر رہی ہے
زباں یہ تو ہے زندگی کی علامت
ہے جب تک کہ انسان زندہ زمیں پر
یہ اردو ہے اک منبعِ خیر و برکت
اگر جذبۂ اخلاص رکھتے ہو دل میں
میرا مشورہ ہے بہ نیّتِ مخلصانہ

قلم کار جادو رقم دوستو
عدم کی طرف یہ سفر کر رہی ہے
رہے گی خود اپنے ہی بل پر سلامت
اسے ختم ہونے کا ہرگز نہیں ڈر
یقیناً جیے گی بصد شان و شوکت
زوال اس کو ہوگا یہ ہرگز نہ سوچیں
اسے سربلندی کی راہیں دکھانا

دعا دیجیے گا اسے زندگی کی
فروغِ مسلسل کی، پائندگی کی

اک دیا اور بجھا

نئی دہلی۔ طنز و مزاح کے منفرد اردو شاعر جناب بازغ بہاری کا ۲۲ جولائی ۲۰۰۹ء کو کلکتہ میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۵۷ برس کے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ، تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ بازغ بہاری بہت مقبول شاعر تھے۔ ہندو پاک کے علاوہ عالمی سطح پر اردو کی دوسری بستیوں میں بھی وہ مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ انھوں نے طنز و مزاح کی شاعری کو اپنے منفرد لب و لہجے کے ذریعے ایک نئی جہت بخشی تھی۔ چند سال قبل ان کا شعری مجموعہ 'سن خوب کی شام' منظر عام پر آیا تھا جو کافی مقبول ہوا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

اردو نشریہ بند ہونے سے ناراضگی

دربھنگہ (۸ ستمبر)۔ دربھنگہ ضلع میں مقامی کیبل آپریٹر کے ذریعے ای ٹی وی (اردو) کا نشریہ گزشتہ کئی ماہ سے بند کردیے جانے کے سبب اردو والوں میں ناراضگی ہے۔ اس سے متعلق اعجاز احمد اور عرفان الرحمٰن جمیل ایڈووکیٹ سمیت متعدد لوگوں نے مذکورہ چینل کے نشریہ کو جلد شروع کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اگر جلد شروع نہیں کیا جاتا ہے تو تمام مسلم صارفین سے اپیل کی گئی ہے کہ کیبل کا کنکشن واپس کردیں۔ بتایا جاتا ہے کہ صرف تعصب کی وجہ سے اس چینل کے نشریہ کو بند کیا گیا ہے جب کہ قریب کے ضلع مظفرپور اور دیگر اضلاع میں نشریہ جاری ہے۔ واضح رہے کہ ای ٹی وی (اردو) پر قومی سطح کے مشاعرے، قومی اور بین الاقوامی سطح کے اسلامی ممالک کی خبریں اور دیگر دینی و مذہبی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جو کافی معلوماتی ہوا کرتے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام رسالہ: سہ ماہی 'تشکیل'
ڈاکٹر یونس اگاسکر خصوصی اشاعت
مدیران : اصغر حسین قریشی/ مقبول سلیم
ضخامت : ۳۰۲ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
اشاعت : اپریل تا ستمبر ۲۰۰۸ء
ملنے کا پتہ : کوہ نور بیکرز کالونی، شانتی نگر، نزد دوا انڈسٹریز، بھیونڈی تھانے ۔ ۴۲۱۳۰۲ مہاراشٹر
تبصرہ نگار: سعید اختر اعظمی

"کوئی نئی بات کہی ہو تو مقالہ نہیں، دوسروں کے حوالے چھاپنے میں کیا مزا ہے" پر عمل پیرا محقق جب کسی موضوع کا احاطہ کرے تو یقیناً یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ تحقیق کا حق ادا کرے گا۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر نے "اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو" جیسے اہم موضوع کا انتخاب کیا اور ممبئی یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تو کسی کو حیرانی نہیں ہوئی۔ اسی پر بس نہیں، انھوں نے مراٹھی ادب کا مطالعہ کرنے کے ساتھ اس زبان کے بارہ افسانوں کے تراجم، مہاراشٹر کے ادبی و ثقافتی پہلو اور مہاراشٹر کے سنت نام دیو کے کوائف یکجا کیے تو اہل ادب کو ان کی عرق ریزی اور کوشش کا لوہا ماننا ہی پڑا۔ اپنے علمی سفر میں نہ صرف یہ کہ انھوں نے ماضی کی یادوں کو خامہ و قرطاس کے ارتباط سے مجتمع کیا بلکہ فکشن اور تنقید تک اپنے دائرۂ فکر کو وسعت دی۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر کی حیات و خدمات پر مشتمل سہ ماہی 'تشکیل' کا یہ خصوصی شمارہ ایک صاحب قلم کو خراج تحسین پیش کرنے کی امتیازی سعی ہے جسے سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول تصویروں کے آئینے میں، دوم ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، رشید و قاضی، اصغر حسین قریشی اور ضیا باغی کے قلم سے ادبی تعارف، سوم سفر نور الحسن علی، غلام حسین ...، انجم عباسی اور مشتاق رضا کے تاثرات، چہارم مراٹھی ادب کا مطالعہ، پنجم کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو، فکر و فن اور فکشن، بے چہرہ شام اور نثر سحرات پر یوسف ناظم، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، علی امام نقوی، ڈاکٹر خورشید نعمانی رودولوی، ڈاکٹر انور صدیقی، ڈاکٹر یعقوب یاور، محمد ایوب واقف، سلام بن رزاق، محمد حسین پرکار اور یعقوب راہی کی گراں قدر تحریریں، ششم میں اپنے بارے میں، یادوں کی بستی بھیونڈی اور حامد اللہ ندوی کے حوالے سے گفتگو کے ساتھ غالب اور تنقید حالی، فراق کی تنقید نگاری، بے آنند، ساحر شیوی، گنگا دھر ڈگل، اروند گوکھلے، بھاؤ پاڈے اور ناڈ گوکر پر تنقیدی نظر، چار طبع زاد اور دو ترجمہ شدہ افسانے، بیدی و اختر الایمان سے ملاقات، ہفتم میں مدیران جریدہ اگاسکر سے تفصیلی ملاقات اور ہشتم میں تین درجن مشاہیر کے خطوط کی شمولیت ہے۔

مدیران کی یہ مساعی قابل قدر اور خوب ہے۔ یونس شناسی کے حوالے سے اسے گراں قدر اور مبسوط کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔

●●●

نام کتاب : شام تنہائی
مصنف : پروفیسر زاہدہ زیدی
ضخامت : ۱۳۵ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتا : انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر ۲۱۲ ۔ راؤز ایونیو، نئی دہلی ۲
تبصرہ نگار : کلدیپ گوہر

زیر تبصرہ شعری مجموعے سے پیشتر مصنفہ کے چار شعری مجموعے 'زہر حیات' (۱۹۷۰ء)، 'دھرتی کا لمس' (۱۹۷۵ء)، 'سنگ جاں' (۱۹۸۸ء) اور 'شعلۂ جاں' (۲۰۰۰ء) شائع ہوکر خواص و عوام سے داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ موجودہ مجموعہ ایک حمد، سولہ نظموں، بائیس غزلیات، سانحہ گجرات کے تحت تین نظموں، سانحہ عراق کے عنوان کے تحت چار نظموں اور یادرفتگاں کے عنوان کے تحت دو مرثیوں پر مشتمل ہے۔ محترمہ کی اب تک مختلف اصناف سخن پر اکیس کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ محترمہ کی شاعری پُرتاثیر ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ایک چھوٹی سی نثری نظم 'نغمۂ خاموش':

آسماں کے صحرا پر چاند کا سفر تنہا
دور تک ستاروں کا بے نوا نگر تنہا
ندی کے ساحل پہ سوچتا شجر تنہا
سانس لیتی خاموشی دھند کے بام و در تنہا
سوچ سوچ ایسی سونا سونا گھر تنہا
سانس لیتے تاروں پر ایک نغمۂ خاموش
دور دل نگر تنہا

شاعرہ نے تنہائی اور خاموشی کے رقص کا کیسا دلفریب منظر کھینچا ہے۔

ایک اور نظم (نثری نظم) پیش ہے جس کا عنوان ہے 'سنگ جاں':

آب خفتہ میں
اک سنگ پھینکا تو ہے
—— دائرے
سطح ساکت پہ ابھرے ہیں
پھیلیں گے مٹ جائیں گے
اور وہ سنگ جاں
اپنی بیداستاں
زیر بار ہجوم گراں
ایک سنگ ملامت کی مانند
دہرائے گا

ایک اور نثری نظم پیش ہے جس کا عنوان ہے 'بزم ہوئی':

جلاؤ شمع دل
کہ رفتہ رفتہ
کہ تیرگی پگھل سکے...
اٹھاؤ ساز دل
کہ اجنبی صداؤں کا یہ شور
ایک راگنی میں ڈھل سکے

شمع دل کے جلنے سے کہ تیرگی کا پگھلنا اور ساز دل سے اجنبی صداؤں کا شور راگنی میں ڈھل جائے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ شاعرہ کا تخیل بہت وسیع ہے، مناسب الفاظ کا بھی فقدان نہیں ہے۔ شاعرہ اپنے مشاہدے کی آنکھیں کھلی رکھتی ہیں تبھی تو کلام میں دم خم ہے۔

اب ذرا غزلیات کے اشعار سے بھی حظ اٹھایئے:

پھر کسی یاد کی کشتی میں رواں ہیں لمحات
جیسے دل آج بھی ہے وقف جہاں آج بھی ہے

ہزار بار بنائیں سجائیں تصویریں
بس ایک بار تصور میں اس کو دیکھا تھا

منزلیں اور بھی ہیں عشق انا سے آگے
بات بگڑی ہوئی بنتی ہے تو بن جانے دو

کچھ اور شاید جستی ابھی سنوار مجھے
عروس مرگ سے ہوتا ہے ہمکنار مجھے

شعور و فکر سے آگے ہے پیکر تخلیق
بہت کہ سنگ تو بچنے لگے گا پانی بھی

[illegible]

مگر یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ محترمہ کی نثری نظمیں ان کی غزلیہ شاعری سے زیادہ پُراثر ہیں۔ یوں تو مصنفہ نے مختلف صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن 'شام تنہائی' میں وہ ایک ایسے غزل گو کی حیثیت سے سامنے آتی ہیں جس کے ہاں روایت اور انفرادیت کا امتزاج بہت حد تک متوازن ہے۔ کتاب کے فلیپ پر جناب شمیم حنفی نے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں کتاب کی مناسب پذیرائی ہوگی۔

●●●

نام کتاب : آپ بیتی/ پاپ بیتی
مصنف : ساقی فاروقی
اشاعت : ۲۰۰۸ء
ضخامت : ۲۷۶ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے
ناشر : اکیڈمی بازیافت
کتاب مارکیٹ، اردو بازار
کراچی، پاکستان
تبصرہ نگار : ڈاکٹر مسعود جعفری

ممتاز شاعر و ادیب ساقی فاروقی کی خود نوشت 'آپ بیتی/ پاپ بیتی' پاکستان اور لندن کے ادبی نگارخانوں کی سیر کراتی ہے۔ ساقی کی زبان تخلیقی اور جدید ہے۔ ہر ورق پر نئے فقرے، نیا اظہار ملتا ہے۔ ان کے خیالات میں بلا کی Originality ہے۔ ان کی سوچ میں غضب کی بے باکی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اردو کو غیر معمولی تازگی اور شگفتگی دی ہے۔ پرانے، بوسیدہ، پامال طرز نگارش کا کہیں بھی ذرا سا بھی شائبہ نہیں ملتا۔ ان کی کتاب پڑھتے ہوئے قاری دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتا ہے۔ وہ واقعات کے بہاؤ میں بہہ جاتا ہے۔ اسے گھڑی کی سوئیوں کی حرکات کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کا ہر فقرہ بامعنی اور اثر انگیز ہوتا ہے۔ سنجیدگی کے ساتھ مزاح کی چاشنی بھی اوراق میں موجود ہے۔ جابجا طرح دار جملے دل کو چھونے لگتے ہیں۔ بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ درشت مزاج آدمی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ساقی فاروقی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ بے جھجک سچائی کو واشگاف کردیتے ہیں۔ انھیں برائیوں کی پردہ پوشی کرنی نہیں آتی۔ وہ بڑی سے بڑی قد آور شخصیت کے معائب، کمزوریوں پر چادر ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے شاعر کے فن اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے پاکستان کے مختلف شاعروں کی شاعری اور اس کے امکانات پر بے لاگ تبصرے کیے ہیں۔ ان کے اچھے اور خراب شعروں کا حوالہ دیا ہے۔ اپنے زاویۂ فکر کو مستحکم کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ ساقی فاروقی نے جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات' کی طرح اپنے جنسی تجربات و واقعات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کتاب کا اصلی حسن اس کی ادبی تنقید میں رچا بسا ہے۔ انھوں نے ادب میں دہرائے جانے والے موضوعات پر اپنے سخت ردعمل کو پیش کیا ہے۔ شاعری میں کی جانے والی نقالی پر بھی گہرا طنز کیا ہے۔ وہ بھی برملا کیا ہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا کہ فیض اگر اقبال کی طرز"، ناصر کاظمی فیض کے انداز میں لکھا کرتے تو ان لوگوں کا ادب میں نہ کوئی نام ہوتا اور نہ ہی کوئی مقام ملتا۔ ساقی فاروقی کا سارا زور کلام تخلیقی فکر کی حمایت میں تھا۔ فاروقی نے ن م راشد اور فیض احمد فیض کے شاعرانہ محاسن و معائب کے علاوہ سیرتوں اور کرداروں کی بڑے ہی دلکش انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ ان کے بیان کے آگے مقبول حسین فدا کی تصویریں پھیکی لگتی ہیں۔ ان عہد آفریں شاعروں کی تہذیب و شائستگی، رکھ رکھاؤ کے علاوہ ان کی مروتیں، محبتیں، رفاقتیں سب قرطاس پر ابھر آئی ہیں۔ فاروقی نے ایک ایسا آئینہ خانہ سجا دیا ہے جس میں شاعروں کے خدوخال، جذبے، احساسات، دکھ درد، رجائیت، قنوطیت، دوستی کے رنگ صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے باہمی رشتوں کی کہانی اچھی لگتی ہے۔ فاروقی کی اردو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس زبان کا خزانہ لازوال ہے۔ اس کی ورثہ آفرینی ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ انھوں نے اکثر جگہ انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس سے عبارت میں روانی اور تازہ کاری پیدا ہوگئی ہے۔ جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم، جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے، جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے والی کیفیت پیراگرافس میں پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے فقروں پر فیض کی تشبیہات، استعارے صادق آتے ہیں۔ انھوں نے بعض مقامات پر نئے الفاظ تراشے ہیں، مثلاً وصال کے لیے وصالیہ وغیرہ۔ ساقی فاروقی کی ذہانت ہر سطر سے عیاں ہے۔

وہ کراچی میں بھی ذہین، تیز طرار، منہ پھٹ تھے۔ لندن آجانے کے بعد غلط و اشکل، کثیر المذاہب، ہمہ لسانی لبرل یورپی کلچر میں رہ کر ان کی ذہانت اور جدت طبع اور صیقل ہوگئی ہے۔ ان کی آپ بیتی کی سب سے بڑی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ پاکستانی شاعروں کے اچھے اور عمدہ اشعار کوٹ کرتے چلے گئے ہیں۔ اس سے ان کی ہمہ رنگی، ہشت پہلو شخصیت کا پتا چلتا ہے۔ ان کے اعلیٰ، نفیس ذوق شعری کی چند جھلکیاں ملاحظہ کیجیے اور لطف اندوز ہوئیے:

تمہارے ہاتھ میں نخلِ شام بے چارہ
رہتا ہے سدا چاک گریبان سحر بھی
(باقر زیدی)

میں فلک زاد اپنے اندر سے
ٹوٹتا جاتا ہوں روز بروز
(ساقی فاروقی)

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم
(رئیس امروہی)

اترتے ہوئے سبھی سے ہم راہ لے چل
میں بھی اسی تری طرح سے آوارہ و بے کار
(حبیب جالب)

خود اپنے ہی اندر سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر
(اطہر نفیس)

وہ گئے سرِ بازار کے زنداں کی دیواروں سے ہم
ان کے لوگوں کو بس دیوار چنتے ہوئے
(شیدا گوالیاری)

انہی پتھروں پہ چل کے اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے
(مصطفیٰ زیدی)

ہم اتنا کہتے ہوئے اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ مختلف بکھرے واقعات، محاسن، رقابات، دہریت، مزاحی و حساس موضوعات کو ردی کی ٹوکری میں ڈال کر ادبی لحاظ سے کتاب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساقی فاروقی نے اپنی کتاب کو تمام دوستوں اور تمام دشمنوں کے نام معنون کیا ہے۔ کتاب کی قیمت ۳۰۰ روپے رکھی گئی ہے۔ پہلے حصے پر یادوں کی بازیافت اور خوابوں کی بازگشت لکھا گیا ہے۔ یہ آپ بیتی کی پہلی جلد ہے، دوسری جلد بھی شاید عنقریب منظرِ عام پر آجائے گی۔

□□□

بقیہ: بیسویں صدی کا اصلاحی رسالہ 'سودمند'

صفحہ ۳ سے آگے

سنبھالی اور آزادی کے ساتھ قومی و سماجی خدمات میں منہمک ہوگئے اور رسالے کو علی گڑھ سے بدایوں لے آئے۔ اس طرح یہ رسالہ مولانا منگوری کی ادارت میں مطبع نظامی بدایوں میں طبع ہوکر آب و تاب کے ساتھ بدایوں سے نکلنے لگا۔ رسالہ سودمند ۳۲ سے ۳۳ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا جس کا رجسٹریشن نمبر اے ۱۳۳۵ تھا۔

کتاب حیات نظامی بدایونی مطبوعہ ۱۹۳۹ء کے مصنف جناب محمد احمد کاظمی جو مولانا منگوری کے فرزند تھے، نے کتاب کے صفحہ ۱۱۲ پر تحریر کیا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں رسالے کا اڈیٹر مولوی احید الدین نظامی بدایونی کو بنایا گیا۔ جناب کاظمی کی یہ بات ۱۹۲۷ء کی فائل دیکھنے کے بعد غلط ثابت ہوتی ہے۔ اگست ۱۹۲۷ء تک کے شماروں میں اڈیٹر کی حیثیت سے مولانا منگوری کا نام درج ہے اور پرنٹ لائن میں محمد احید الدین ایلف۔ آر۔ اے۔ ایس لندن کا نام درج ہے۔ ہاں ستمبر ۱۹۲۷ء کے شمارے سے سید طفیل احمد منگوری آنریری اڈیٹر کے ساتھ ساتھ اسسٹنٹ اڈیٹر کی حیثیت سے محمد احید الدین نظامی کا نام بھی شامل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر احید الدین ستمبر ۱۹۲۷ء سے رسالہ 'سودمند' کے نائب مدیر تھے۔ مسٹر احید الدین حوالی ۱۹۲۹ء مولانا نظام الدین حسین نظامی بدایونی کے اکلوتے فرزند تھے۔

۱۹۳۳ء تک رسالہ پابندی کے ساتھ بدایوں سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں اس رسالے کے بانیان نے رسالے کو بند کرنے کا منصوبہ بنایا کیوں کہ سودمند تحریک ملک میں اچھی طرح مکمل چکی تھی اور آئندہ اس کو رسالے کی شکل میں چلانا غیر ضروری تھا لہٰذا نومبر ۱۹۳۳ء سے رسالہ 'سودمند' ہمیشہ کے لیے بند کردیا گیا اس طرح یہ اصلاحی رسالہ آٹھ سال پانچ ماہ تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

رسالہ 'سودمند' کا جو فائل مجھے دستیاب ہوا ہے وہ ۱۹۲۷ء پر مشتمل ہے جس میں جنوری سے نومبر ۱۹۲۷ء تک کے گیارہ شمارے مجلد ہیں۔ جنوری اور فروری ۱۹۲۷ء کے شمارے کرم خوردہ ہیں جن کا کچھ حصہ ہی پڑھنے میں آتا ہے۔ اس فائل میں جن اہل قلم کے مضامین شامل ہیں ان میں مولانا منگوری اور مسٹر احید الدین نظامی کے علاوہ شاہ اظہار عالم۔۔۔۔ تحصیلدار اور زمیندار موضع گی الدین پور، حکیم مظفر حسین بسمل، محمد ریاض الدین احمد آف مستان تحصیل میسور، مولوی عبدالقیوم پروفیسر زراعتی کالج کانپور، مولوی عبدالکریم خاں (اسسٹنٹ) ضلع میرٹھ، مولوی محمد اکرام عالم وکیل بدایوں، مولوی عبدالواحد صاحب، عبیداللہ صاحب بیٹے مولوی جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں، مسٹر نور محمد رجب علی نیجنگ ڈائرکٹر حالی انشورنس کمپنی، محمد عطا صاحب نکلن گنج کانپور، محمد بشیر احمد خاں پنجاب، مولانا قمر الحسن قمر بدایونی، محمد حسن محسن دہرہ دونی، محمد علی کیفی چاپوری، سید امیر حیدر بخت اکبرآبادی، رائے بہادر پنڈت شیام بہاری مصر، مسٹر بے آر رائے صاحب بیانہ بھرت پور کے نام سر فہرست ہیں۔

رسالہ 'سودمند' میں شائع شدہ مضامین کی مقبولیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے جون ۱۹۲۵ء سے جون ۱۹۲۶ء تک شائع ہونے والے مولانا طفیل احمد منگوری کے مضامین کو یکجا کرکے الگ کتابی صورت میں 'مضامین سودمند' نام سے ۱۹۲۵ء میں مولانا منگوری نے نظامی پریس بدایوں سے شائع کروائے تھے۔ حفظانِ صحت کے تحت جو مضامین شائع ہوئے تھے وہ بھی یکجا کرکے 'صحت و تندرستی' کے نام سے ۱۹۲۵ء میں مطبع نظامی بدایوں سے کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں۔ ماشاءاللہ۔

کتابیات:

۱- مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگوری، ۱۹۳۸ء۔
۲- روح روشن مستقبل از طفیل احمد منگوری، ۱۹۳۶ء۔
۳- حیات نظامی از محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ، ۱۹۳۹ء۔
۴- بیسویں صدی کے اردو مصنفین از مجیدہ خاتون، ۲۰۰۸ء۔
۵- ذوالقرنین بدایوں کا طفیل احمد نمبر، ۱۹۳۶ء۔
۶- مضامین سودمند، مرتب طفیل احمد منگوری، ۱۹۳۵ء۔

○○○

بقیہ: کیا آج مشاعرے اردو تہذیب......

صفحہ ۸ سے آگے

نفاست کے لیے ہی مخصوص رہی ہیں۔ آج بھی سامعین ان کی نفاست سے لطف اندوز ہوتے کے لیے کھنچے چلے آتے ہیں مثلاً ملک زادہ منظور احمد، عمر قریشی، انور جلالپوری وغیرہ اور مرحوم ثقلین حیدر کی نظامت کا بھی اپنا مخصوص انداز تھا۔ لیکن آج کے بیشتر مشاعروں کے ناظم حضرات کے ادبی و تہذیبی شعور کا اندازہ ان کے ان جملوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ''اب میں ایک ایسے شاعر کو بلانا چاہوں گا''، ''اب ایک ایسا شاعر آپ کے سامنے آرہا ہے''، ''اب میں اس شاعر کو آواز دے رہا ہوں''، ''اب وہ شاعر آپ کے بیچ آرہا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی شاعرہ ہے تو اس کے لیے ایک مخصوص لہجے میں کچھ اس قسم کے جملے (فقرے) استعمال ہوتے ہیں: ''اب ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ...''، ''سامعین اپنا دل تھام لیں کیوں کہ اب ایک ایسی...''، ''آپ کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اب میں اس شاعرہ کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں...'' وغیرہ وغیرہ۔

دراصل آج لوگوں نے مشاعروں کو اپنے اپنے طور پر مختلف مفادات کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ مشاعرہ برائے مشاعرہ کے تصور نے جہاں ایک زمانے تک اردو زبان و ادب اور خصوصاً اردو تہذیب کو توانائی بخشی تھی وہیں اب مشاعرہ برائے قومی یک جہتی، مشاعرہ برائے مشترکہ تہذیب، مشاعرہ برائے تحفظ امن و امان کی نئی روش نے مشاعروں کو پروپیگنڈہ سے قریب تر کردیا ہے۔ لوگوں نے اس بنیادی امر کو فراموش کردیا ہے کہ اردو زبان و ادب کا وجود بذاتِ خود قومی یک جہتی، مشترکہ تہذیب اور باہمی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ خواہ وہ اردو زبان کی تشکیل و اس کی نشو و نما کا پہلو ہو یا پھر اس کی ادبی و تہذیبی قدروں کی پرورش کا پہلو۔ لیکن جب سے یہ Thesis Develop ہوئی ہے کہ ''اردو تقسیم کی زبان ہے''، اردو کو مشکوک و متعصب نظروں کا شکار ہونا پڑا ہے۔ اس ناانصافی کے لیے اہل اردو بھی اتنے ہی ذمہ دار ہیں جتنے کہ غیر اہل اردو۔

دورِ حاضر کے مشاعروں پر سیاسی رنگ غالب ہوگیا ہے۔ پہلے کے منتظمین مشاعرہ کسی ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں نہ صرف زبان و ادب کا ذوق و شوق ہوتا تھا بلکہ تہذیبی شعور بھی ہوتا تھا، جب کہ آج زیادہ تر مشاعروں کے کنوینر سیاسی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ جب چاہا مشاعرے کے نام پر برادروں کا مجمع اکٹھا کرلیا۔ چوں کہ مشاعروں کے سامعین میں اکثریت اقلیتی طبقے کی ہوتی ہے اس لیے ایک طرح سے اقلیت کو خوش کرنے اور اس تک اپنی بات پہنچانے کا ایک پلیٹ فارم بھی بنالیا گیا ہے مشاعرے کے اسٹیج کو۔ غور طلب ہے کہ اس عمل میں مالی طور پر بھی بڑا فائدہ ہوتا ہے کیوں کہ چندے باز اور سیاست باز منتظمین نے مشاعروں کو حصولِ زر کا اچھا ذریعہ بنالیا ہے۔ ظاہر ہے ایسے میں شعرا و شاعرات کے انتخاب کا اندازہ بھی آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی اچھا شاعر آتا بھی ہے تو وہ کنوینر سے کتنا منحرف ہو پاتا ہے کیوں کہ آئندہ بھی تو آنا ہے۔ غالباً اسی لیے آج زیادہ تر مشاعرے محض Entertainment Event بن کر رہ گئے ہیں کیوں کہ اہل زبان و ادب کی گرفت مشاعروں پر کمزور پڑتی جارہی ہے اور اردو کی بدولت Three star life style میں رہنے والے لوگ اس حقیقت سے غافل ہیں کہ ہماری شناخت اور ہمارے تہذیبی ورثے کا ایک اہم حصہ ہم سے چھوٹا جارہا ہے۔

□□□

کیا آج کے مشاعرے اردو تہذیب کے زوال کا باعث ہیں؟

احسان حسن (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد-۲۱۱۰۰۲)

آج اہلِ زبان و ادب اس امر پر متفق رہے ہیں کہ اردو ایک زبان ہی نہیں بلکہ مکمل تہذیب ہے اور اس کا اصلی درس کتابوں سے نہیں بلکہ صحبتوں سے حاصل ہوتا ہے:

حریمِ حسن سی ہے جگر کا شانۂ اصغر
جو بیٹھو باادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر
(جگر مرادآبادی)

اس لحاظ سے مشاعرے صحبتوں کا اہم مرکز قرار دیے گئے۔ مشاعروں نے اردو کی تہذیب کو پروان چڑھانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اردو مشاعروں کی حیثیت ایک تہذیبی گہوارے کی رہی ہے۔ مشاعرے زبان کی سلیقہ مندی کا جوہر سکھانے کے ساتھ ہی ساتھ داد و تحسین لینے اور دینے کا شائستہ شعور بھی عطا کرتے تھے۔ مشاعرے نہ صرف مستقبل کے ادب کا پتا دیتے تھے بلکہ آدابِ محفل اور اجتماعیت کی تہذیبی نزاکتوں سے بھی روبرو کراتے تھے۔ افسوس ہے کہ مشاعرے جو اردو زبان و تہذیب کی درس گاہ سمجھے جاتے تھے، آج بدذوقی و بے ادبی کی دلدل بن چکے ہیں کیوں کہ:

۱- مشاعروں میں شعرا کے بیٹھنے کی تہذیب ختم ہو چکی ہے، ورنہ استاد شعرا آگے کی صف میں اور شاگرد و مبتدی شعرا پیچھے کی صف میں مودبانہ بیٹھا کرتے تھے۔ آج نئے شاعروں میں گاؤ تکیے کے سہارے آگے کی صف میں بیٹھنے کی بے قراری رہتی ہے جس سے کہ اگلے دن اخبار میں چھپنے والی تصویر میں اُن کی شناخت بآسانی ہو سکے۔

۲- آج کے مشاعروں میں زیادہ تر شعرا کا حال یہ ہے کہ وہ جب اپنی پیش کش کے درمیانی لمحوں سے گزر رہے ہوتے ہیں تو خود کو مضطرب دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ "اور یہ شعر سنیے! اور یہ شعر سنیے!" جملے کے ساتھ گویا سامعین کو للکارتے ہیں۔ مشاعروں کی یہ تہذیب ہرگز نہ تھی۔ "اس شعر کی اجازت فرمائیں"، "یہ مصرعہ نذر کرتا ہوں" جیسے جملے کمیاب ہوتے جا رہے ہیں۔

۳- مقطع کو ختم کرنے میں عام طور پر شعرا جلد بازی ظاہر کرتے ہوئے تسلیم کے ساتھ واپس اپنی جگہ بیٹھ جانے کی کوشش کیا کرتے تھے تاکہ دوسرے شاعر کو موقع ملے۔ لیکن اب یہ تہذیب ختم ہو چکی ہے۔ آج کا شاعر پورا وقت لیتے ہوئے اپنے تخلص کے ساتھ مقطع کو دوہرانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

۴- آج کے مشاعروں میں داد و تحسین کے طریقے بدل چکے ہیں۔ "واہ! واہ!"، "کیا خوب ہے!"، "کیا کہنے صاحب!" جیسے قدر شناس جملوں کی جگہ تالیاں رائج ہو گئی ہیں۔ تو وہیں شعرا نے "اگر پسند آ جائے تو داد ضرور دیجیے گا"، "داد کی درخواست ہے" جیسے جملوں کو اپنی پیش کش کا بسم اللہ بنا رکھا ہے اور حد تو تب ہو جاتی ہے جب تھوڑی بہت تالیوں پر تڑپ کر شاعر چیخ پڑتا ہے "دل کھول کر داد دیجیے!"۔ ادھر کچھ برسوں سے ایک نئی ادا زور پکڑتی جا رہی ہے وہ ہے دعائیں چاہنے کی۔ شاعر سامعین کی صف میں چند ٹوپیاں دیکھ کر دو شعر پڑھتے ہی بڑی عاجزی سے دعائیں دینے کی خواست کرنے لگتا ہے۔ اس طرح مذہبی اقدار کے سہارے لوگ اپنی مقبولیت کے جھنڈے بلند کرنا چاہتے ہیں۔ اردو مشاعروں کی تہذیبی روایت ان سب کی اجازت ہرگز نہیں دیتی۔ شعرا اپنے وقار و معیار کے ساتھ کلام پیش کیا کرتے تھے اور پھر کلام خود بخود داد و تحسین کی مقدار طے کرتا۔

۵- ادھر تقریباً ایک ڈیڑھ دہائی سے شاعرات کی آمد نے مشاعروں کی تہذیب پر بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ کچھ شاعرات بلاغت سے بھرپور بناؤ سنگار کرتی ہیں جس میں فصاحت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ مقام کی مناسبت دیکھتے ہوئے سامعین سے اپنے رشتے استوار کرنے لگتی ہیں مثلاً "میرے سسرال والو!"، "یہ تو میرا ننھیال ہے!" وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے ایسی شاعرات کا نہ ہی شعر و سخن سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی اردو تہذیب سے۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ شاعرات کی موجودگی مشاعروں میں توازن پیدا کرتی تھی جس سے نہ صرف شعر و سخن اور زبان و ادب کی جمہوری قدروں میں اضافہ ہوتا تھا بلکہ تہذیبی عناصر کو بھی جلا ملتی تھی۔ برصغیر ہند و پاک کی مختلف شاعرات نے اس کی بہترین مثالیں قائم کی ہیں اور اپنے کلام کی بالیدگی سے سامعین کی بے شمار داد و تحسین حاصل کی ہیں مثلاً مینا قاضی (بمبئی)، شمع زیدی (دہلی)، یاد دہلوی، رباب بانو وفا (لکھنؤ)، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، زہرہ نگاہ، فاطمہ حسن، شاہدہ حسن اور پروین شاکر وغیرہ۔

۶- مشاعروں کی تعداد میں اضافہ بھی مشاعروں کی پستی کا ایک بڑا سبب ہے۔ ایسے ایسے لوگ شعرا کی صف میں شامل ہو چکے ہیں جنہیں اردو لکھنا پڑھنا تک نہیں آتا۔ ریاکاری میں اشعار لکھوائے جاتے ہیں اور پھر ان کے دم پر مشاعرے لوٹنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اب کلام خریدے اور بیچے جانے لگے ہیں۔ اساتذہ کو اپنا کلام بیچنا ہے، خریدنے والا یا والی کوئی بھی ہو۔ اُسے اردو آتی بھی ہو یا نہیں۔ زبان سے ہی تہذیب اور کلچر کو جلا ملتی ہے۔ آج مشاعروں میں شرکت کرنے والوں کا ایک بڑا طبقہ اردو زبان و ادب سے نابلد رہتا ہے جس سے شائستہ گفتگو کی امید ہی بے معنی ہے۔ غور طلب ہے کہ یہ محرومی شعرا اور سامعین دونوں ہی پہلوؤں پر برقرار ہے۔

۷- آج فلمی دھنوں کے طرز پر غزلیں پڑھی جا رہی ہیں۔ ورنہ اردو مشاعروں میں کلاسیکی ترنم کا ایک اپنا احترام ہوتا تھا۔ غزل ہو یا نظم شعرا اُس کے تخلیقی مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترنم کا اہتمام برتتے تھے۔ مشاعروں میں ترنم کا اپنا انداز ہوا کرتا تھا جس سے سامعین کے دل و دماغ پر ایک گہرا و دیرپا تاثر قائم ہوتا تھا۔ اُستاد شعرا کے ترنم کا تو سامعین کو بے صبری سے انتظار رہتا کیوں کہ اُن کے اتار چڑھاؤ کا، اُن کے آہنگ اور اُن کی لے کا اپنا مخصوص طریقہ ہوا کرتا تھا۔ اب یہ سب قدریں دم توڑ چکی ہیں، سادگی و معصومیت کے لہجے غائب ہو چکے ہیں۔ ترنم کے نام پر بیہودگی رائج ہوتی جا رہی ہے۔

۸- اردو مشاعروں کی اپنی روایت میں اچھے تحت کو ترنم سے کم اہمیت کبھی نہیں دی گئی۔ بات دار آواز میں حساس طریقے سے پیش کیے گئے تحت کو سامعین کی بے شمار داد و تحسین ملتی تھی۔ اس ضمن میں کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، سلام مچھلی شہری، قیصر زیدی، اعجاز صدیقی اور شاذ تمکنت وغیرہ کے تحت کی مثالیں موجود ہیں۔ لیکن آج کے کچھ شعرا تحت کے نام پر جس طرح غیر سنجیدگی سے چیخ چیخ کر اور مسلسل ہاتھ پیر کی حرکت کے ساتھ کلام پیش کرتے ہیں اس سے نہ صرف شاعرانہ قدریں مجروح ہوتی ہیں بلکہ سامعین کی بھی بے حرمتی ہوتی ہے۔ پھر تو مشاعرے میں شرکت کی بجائے ڈرامہ دیکھنا اور دکھانا بہتر۔

۹- مشاعرے میں ناظم کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کیوں کہ ناظم ہی شعرا اور سامعین کے درمیان سنانے اور سننے کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ ناظم ہی مشاعرے کو منتشر ہونے سے بچاتا ہے اور اُس کی رفتار اور اُس کے تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ مشاعرے کی تہذیبی صورتوں اور ادب و آداب کا بہت کچھ دار و مدار ناظمِ مشاعرہ پر ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے نظامت کو ایک نازک فریضہ تصور کیا جاتا ہے اور حاضر جواب، فراخ دل و غیر جانب دار لوگوں کو خصوصاً اس کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ اردو مشاعروں میں نظامت کا ایک اعلا معیار رہا ہے اور اپنے اپنے عہد میں کچھ شخصیتیں

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اڈیٹر: خلیق انجم
پرنٹر، پبلشر: شاہد خاں　　مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند) ۲۱۲-اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے　سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236209 Fax: 011-23239547
E-mail: anjuman.urdughar@gmail.com
Http://www.anjuman-taraqqi-urdu-hind.com